اسلام اور تھیاکریسی

عبد الحمید

(۲)

اس کے علاوہ ان دونوں کے اساسی تصورات بھی ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ تھیاکریسی کی عمارت جس بنیاد پر اٹھائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ حکومت گناہ کا نتیجہ ہے۔ یہ نظریہ درحقیقت اُس غلط تصور کا شاخسانہ ہے کہ خداوند تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السّلام کو اُن کے اوّلیں گناہ کی پاداش میں اس دنیا میں اُتارا۔ لہٰذا محکومیت اور وہ جبر اور ظلم جو حکومت کا لازمی جزو ہے، سب اسی ایک گناہ کی سزا ہیں۔ ریاست کے وجود میں آنے کا سبب بھی یہی ہے کہ انسان نے خدا کے احکام سے رُوگردانی کر کے شیطان کا کہا مانا۔ لیکن تقدیرِ الٰہی سے مفر نہیں۔ انسان کو دنیاوی زندگی ہر صورت سے بھگتنا ہے اور اس طرح اُن تمام مصائب کو بھی جھیلنا ہے جو دنیاوی زندگی کا خاصہ ہیں کیونکہ خدا کا منشا یہی ہے۔ ان سب باتوں کو جانتے ہوئے انسان کو چاہیے کہ وہ حکومت ایسے ظالمانہ ادارے کی ساری جبیرہ دستیوں کو نہایت ہی خندہ پیشانی سے برداشت کرے اور اس معاملہ میں وہ جس قدر صبر و ثبات کا ثبوت دے گا اسی قدر وہ آخرت میں انعام کا مستحق ٹھیرے گا۔ ریاست بڑی حد تک ڈاکوؤں کا راج ہے۔ مگر اسے انسانی سیرت اور سرشت کے عیب نے ہی جنم دیا ہے اور اس لحاظ سے اس سے سرکشی کرنا خدا کے منشا کے خلاف ہے۔ چنانچہ پروفیسر کولنز (COLLINS) اپنے ایک مشہور لیکچر بعنوان (UNITY, CATHOLIC & PAPAL) میں لکھتا ہے:۔

> "حکومت ایک ایسا ادارہ ہے جس کی بنیاد انسانوں کی بجائے خدا نے رکھی ہے، لہٰذا جس قسم کی حکومت بھی ہو وہ عین منشاءِ الٰہی کے مطابق ہے۔ اور اس میں ردّوبدل کا خیال بھی راہِ راست سے انحراف ہے۔"

اسلام بنیادی طور پر انسان کے پیدائشی گنہگار ہونے کے تصوّر کو غلط قرار دیتا ہے اور اس طرح اس تخیّل کی کوکھ سے جتنے باطل نظریات نے جنم لیا ہے، خواہ اُن کا تعلق سیاست و آئین سے ہو، یا علم و فلسفہ سے، سب کی نفی ہو جاتی ہے۔ حضرت آدم علیہ السّلام کی ندامت و انفعال پر حق تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرمالی اور اب اُن کی مقدس ذات پر گناہ کا کوئی معمولی سے معمولی دھبہ بھی باقی نہ رہا۔ انھیں دنیا میں رہنے کا جو حکم دیا گیا تھا وہ اُن کے معاف کر دیئے جانے کے بعد بھی اس لیے برقرار رہا کہ علم خداوندی میں یہ بات تھی کہ آدم دنیا ہی میں رہ کر اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاسکیں گے۔ علامہ اقبال مرحوم نے اپنی کتاب اسلامی الٰہیات کی جدید تشکیل میں حضرت آدم کے جنّت سے نکلے جانے کی نہایت ہی بلیغ تفسیر پیش فرمائی ہے۔ وہ کہتے ہیں:۔

> "جنت میں آدمؑ کی زندگی دراصل انسانیت کے اس ابتدائی دور سے عبارت ہے جب کہ اس میں احساس خودی پیدا نہ ہُوا تھا اور اُس نے اپنے ارادہ اور علم کی قوت سے ماحول سے مطابقت کرنا نہ سیکھا تھا۔ اُس کا دل آرزو اور احتیاج کی خلش سے بیگانہ تھا۔ یہ واقعہ دراصل اس حقیقت کی یادگار ہے کہ کس طرح انسان نے اپنے جبلّی میلانات کے دائرہ سے باہر قدم نکالا اور ایک آزاد اور با اختیار ایغو کا مالک بنا۔ اس میں آگہی و توقف شک اور خلاف ورزی کی صلاحیت پیدا ہو گئی۔ آغوش فطرت میں طویل خواب کے بعد اب وہ بیدار ہُوا اور اس کو پہلی مرتبہ یہ محسوس ہُوا کہ واقعات و حوادث کے اسباب اس کی ذات میں پنہاں ہیں۔ آدم کی نافرمانی اس کے لیے ایک سبق تھی۔ اس طرح اُس نے اپنے اختیار و ارادہ کو برتنا سیکھا۔ اس لیے اُس کا قصور معاف کر دیا گیا۔ قرآن حکیم میں اس کا ذکر نہیں ملتا کہ بہشت سے نکلنے کے بعد دنیا آدم کے لیے کلفت و زحمت کی جگہ بنائی گئی تاکہ وہ اپنے گناہ کی سزا پائے۔ یہ تصوّر بالکل غیر اسلامی ہے[1]"

اسی طرح عہد حاضر کے ایک عظیم اسلامی مفکر اپنی تفسیر تفہیم القرآن میں اس نکتہ کی وضاحت

---

[1] ترجمہ از ڈاکٹر یوسف حسین خاں

کرتے ہوئے فرماتے ہیں :۔

"آدم نے توبہ کی اور اللہ نے قبول کر لی۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ آدم اپنی نافرمانی پر عذاب کے مستحق نہ رہے۔ گناہ گاری کا جو داغ ان کے دامن پہ لگ گیا تھا وہ دھو ڈالا گیا۔ نہ یہ داغ ان کے دامن پر رہا، نہ ان کی نسل کے دامن پہ اور نہ اس کی ضرورت پیش آئی کہ معاذ اللہ! خدا کو اپنا اکلوتا بھیج کر نوعِ انسانی کا کفارہ ادا کرنے کے لیے سولی پر چڑھوانا پڑتا۔ برعکس اس کے اللہ نے آدم علیہ السّلام کی توبہ ہی قبول کرنے پر اکتفا نہ فرمایا، بلکہ اس کے بعد انہیں نبوت سے بھی سرفراز کیا تاکہ وہ اپنی نسلِ انسانی کو سیدھا راستہ بتا کر جائیں۔ اب جو جنّت سے نکلنے کا حکم پھر دہرایا گیا، تو اُس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ قبولِ توبہ کا یہ مقتضیٰ نہ تھا کہ آدم کو جنّت ہی میں رہنے دیا جاتا اور زمین پر نہ اُتارا جاتا۔ زمین اُن کے لیے دارالعذاب نہ تھی، وہ یہاں سزا کے طور پر نہیں اتارے گئے، بلکہ انہیں زمین کی خلافت ہی کے لیے پیدا کیا گیا تھا۔ جنّت ان کی اصلی جائے قیام نہ تھی وہاں سے نکلنے کا حکم اُن کے لیے سزا کی حیثیت نہ رکھتا تھا۔ اصل تجویز تو ان کو زمین پر اتارنے کی تھی۔ البتہ اس سے پہلے ان کو اُس امتحان کی غرض سے جنّت میں رکھا گیا تھا۔"

قرآن پاک کے ایک بلند پایہ مفسّر علّامہ ابنِ کثیرؒ اپنی شہرۂ آفاق تصنیف میں حضرت ابنِ عباسؓ رضی اللہ عنہ سے یہ روایت نقل فرماتے ہیں :۔

"حضرت آدم نے کہا خدایا کیا تو نے مجھے اپنے ہاتھ سے پیدا نہیں کیا؟ اور مجھ میں اپنی روح نہیں پھونکی . . . . کیا تیری رحمت غضب پر سبقت نہیں کر گئی؟ کیا میری پیدائش سے پہلے یہ خطا میری تقدیر میں نہیں تھی؟[1] جواب ملا کہ ہاں یہ سب میں نے کیا ہے تو کہا

---

[1] ممکن ہے کہ اس سے کسی شخص کے ذہن میں یہ غلط فہمی پیدا ہو کہ جب اُن کی تقدیر میں اسی طرح لکھا جا چکا تھا تو اُن کا اس میں کیا قصور ہوا۔ اسی مقام کی تصریح میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی لکھتے ہیں :۔

"زمین یعنی اپنی جائے تقرر پر خلیفہ کی حیثیت سے بھیجے جانے سے پہلے ان دونوں کو (باقی ص۴۸ پر)

پھر خدایا میری توبہ قبول کر کے مجھے جنت مل سکتی ہے یا نہیں؟ جواب ملا کہ ہاں "

چند سطح بیں آنکھوں کے لیے عیسائیت اور اسلام کے درمیان یہ اختلاف خواہ کس قدر معمولی ہو، مگر وہ شخص جس نے کبھی بھی زندگی کی گہرائیوں میں اتر کر اس کا مطالعہ کیا ہے وہ اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہے کہ اس "معمولی فرق" نے دونوں قوموں کی زندگیوں میں ایک عظیم تفاوت پیدا کر دیا ہے۔ ایک کے نزدیک اگر یہ زندگی دارالعذاب ہے تو دوسرے کے نزدیک یہ خدا کا سب سے بڑا فضل اور احسان ہے جس کے ذریعہ اُسے اپنے مالک حقیقی سے اپنے تعبّد اور وفاداری کے ثابت کرنے کا پورا پورا موقع بہم پہنچتا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ عیسائیت اور اسی طرح کے دوسرے مذاہب کو ماننے والے لوگ اس حیات کو ایک بارِ گراں خیال کرتے ہوئے، اور دنیاوی تعلقات کو طوق و سلاسل سمجھتے ہوئے اس سے فرار اور گریز کی راہیں اختیار کرنے لگے۔ انہوں نے غلطی سے یہ سمجھ لیا کہ انسان کے لیے سب سے بڑی مصیبت یہ زندگی اور اس کی مادّی احتیاجات ہیں اس لیے نیکی اسی میں ہے کہ جسم کو زیادہ سے زیادہ اذیّت پہنچا کر اس قفسِ عنصری کو اس قدر کمزور کر دیا جائے کہ طائرِ روح جب چاہے آزادانہ اپنے آشیانہ کی طرف پرواز کر سکے۔ زندگی کے متعلق اس نقطۂ نظر کو اختیار کر لینے کے بعد جسم اور اس کے متعلقات سے نہ صرف انسان غفلت برتنا شروع کر دیتا ہے بلکہ اس کے خلاف ایک ایسا معاندانہ جذبہ بھی پیدا کر لیتا ہے جو کسی راہ رو کو ایسے پتھر کے مقابلہ میں پیدا ہوتا ہے جس سے اُس نے بار بار ٹھوکر کھائی ہو، یا ایک مہجورِ آشیاں

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۸۷) امتحان کی غرض سے جنّت میں رکھا گیا تھا تاکہ ان کے رجحانات کی آزمائش ہو جائے اس امتحان کے لیے یہ جنت ہی کا مقام سب سے زیادہ موزوں تھا۔ دراصل اسے امتحان گاہ بنانے کا مقصود یہ حقیقت انسان کے ذہن نشین کرنا تھا کہ تمہارے لیے تمہارے مرتبۂ انسانیت کے لحاظ سے جنّت ہی لائق و مناسب مقام ہے لیکن شیطانی ترغیبات کے مقابلے میں اگر تم اللہ کی فرمانبرداری کے راستے سے منحرف ہو جاؤ گے تو جس طرح ابتدا میں اس سے محروم کیے گئے تھے اسی طرح آخر میں بھی محروم ہی رہو گے اپنے اس مقام لائق کی، اپنی اس فردوسِ گم گشتہ کی بازیافت تم صرف اسی طرح کر سکتے ہو کہ اپنے اس دشمن کا کامیابی سے مقابلہ کرو جو تمہیں فرمانبرداری کے راستے سے ہٹانے کی کوشش کرتا ہے"!

طائر کے دل میں اپنے قفس کے خلاف پیدا ہوتا ہے۔ اس طرزِ فکر نے انسانوں کو متمدن بستیوں سے نکال کر انہیں صحراؤں اور ویرانوں میں لا کر آباد کر دیا، انہوں نے زندگی اور اس کے مسائل میں دلچسپی لینے کی بجائے اس سے کنارہ کشی اختیار کرنا شروع کر دی۔ اگر ان راہبوں کی زندگیوں کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کی زندگی ہر قسم کی حس و حرکت سے عاری تھی اور ان کی زلیست پر موت کا دھوکا ہوتا تھا۔ تاریخ اخلاق یورپ کا مصنّف پروفیسر لکی نہایت ہی تفصیل کے ساتھ اس موضوع پر بحث کرتا ہے۔ وہ لکھتا ہے:-

> "مشرکانہ تعدیوں کا مسیحی نفوس پر ایک اثر یہ بھی پڑا کہ جو شخص مذہب کے لیے جتنی زیادہ تکالیف اُٹھاتا ہے اسی قدر اسے ثواب ملتا ہے۔ بس تعدیوں کے خاتمہ پر جب مظالم برداشت کرنے کا کوئی موقع نہیں رہا تو خوش اعتقاد ہستیوں نے جنگل میں جا جا کر طرح طرح کی تکالیف اپنے لیے پیدا کیں۔ لوگوں کے تخیل کو اس طرزِ زندگی سے خاص طور پر کوشش کر کے متأثر کیا گیا۔ نئے لوگ اس میں اہتمام سے بھرتی کیے جانے لگے اور اس داخلہ میں عورتوں نے پوری سرگرمی سے کوشش شروع کی[1]"

دنیا کی تاریخ میں شاید اس وبائے رہبانیت سے زیادہ پُر درد، پُر اثر کوئی داستان نہیں۔ وہ اقوام جو افلاطون (PLATO) اور سقراط کے خم کدہ سے سرشار تھیں وہ بھی دنیا اور اس کے ہنگاموں سے منہ موڑ کر

---

[1] ان لوگوں کے لیے اسوۂ حسنہ سینٹ جمیس کا وجود قرار پایا جس کی ذات میں تمام فضائل انسانی جمع تھے اور جو رحم مادری سے مقدس و مطہر پیدا ہوا تھا اس کے اوصاف یہ تھے کہ :-

> "وہ شراب مسکرات و لحم حیوانات سے محترز تھا۔ اس کے سر پر کبھی استرہ نہیں لگا وہ نہ کبھی حمام گیا اور نہ اپنے جسم میں روغن لگنے دیا۔ اس نے ہمیشہ سوتی کپڑے پہنے۔ اُون کی پوشاک کبھی نہیں پہنی۔ گرجا کے اندر وہ روز تنہا جایا کرتا۔ اور گھٹنوں کے بل جھک کر خلقت کی مغفرت کی دعائیں کیا کرتا۔ اس عمل کی مزاولت کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے گھٹنے اونٹ کے گھٹنوں کی طرح سخت ہو گئے۔"

(تاریخ اخلاقِ یورپ از لیکی ترجمہ از مولانا عبدالماجد دریابادی)

جنگلوں کی طرف جانے لگیں۔ ان کی ساری زندگیاں ہر قسم کے لطیف جذبات اور اچھے احساسات سے عاری ہو کر ظالمانہ خود آزاریوں کے لیے وقف ہو گئیں اور دو چار سال نہیں بلکہ پورے دو سو سال تک جسم کُشی منتہائے اخلاق سمجھی جانے لگی۔ سینٹ جروم نہایت ہی فخر سے بیان فرماتے ہیں :۔

> "ایک راہب صاحب نے ۳۵ سال کی زندگی صرف نانِ جویں اور خاک آلود پانی پر بسر کی تھی۔ ایک اور بزرگ مدۃ العمر ایک تنگ و تاریک غار میں رہا کرتے اور کبھی روزانہ غذا میں پانچ انجیروں سے زیادہ نہ کھایا۔ ایک تیسرے بزرگوار ان سے بھی بڑھ چڑھ کر تھے۔ یہ حضرت سال بھر میں صرف ایک بار ایسٹر کے دن اپنی حجامت بنواتے تھے، نہ کبھی کپڑے دھوتے تھے اور نہ کبھی لباس بدلتے تھے، تاوقتیکہ وہ خود ہی پارہ پارہ ہو کر جسم سے علیحدہ نہ ہو جائے۔ آنکھوں کی بصارت نے شدّتِ فاقہ کشی سے جواب دے دیا تھا اور جسم کی جلد مثل پتھر کے سخت اور کھُری ہو گئی تھی۔ اسی طرح سینٹ میکریس اسکندری کی بابت مشہور ہے کہ وہ چھ ماہ تک برابر ایک دلدل میں سویا کرتے تاکہ اُن کے برہنہ جسم کو زہریلی مکھیاں ڈسیں۔ نیز یہ کہ وہ ہمیشہ ایک من لوہے کا وزن اپنے اوپر لادے رہتے تھے۔ اُن کے مرید سینٹ یوسیبیس اُن سے بھی بازی لے گئے تھے کہ یہ حضرت ہمیشہ تقریبًا دو من لوہے کا وزن لادے رہتے تھے اور تین سال تک ایک خشک کنوئیں کے اندر مقیم رہے . . . . . . پیلویا ایک مشہور دوشیزہ ہوئی ہیں ان کا سنِ شریف ساٹھ سال تک پہنچ گیا تھا۔ اور بارہا کثافت کے باعث سخت بیمار ہوئیں۔ لیکن کبھی بجز اپنی انگلیوں کے اور کسی حصۂ جسم میں پانی نہیں لگنے دیا[1]۔

ریاضت اور عبادت کے ایسے ظالمانہ طریقے اتنے زیادہ ہیں کہ اُنہیں ایک مستقل کتاب کے صفحات کے اندر بھی سمیٹنا ناممکن ہے۔ ان کے چند نمونے جو یہاں نقل کیے گئے اُن سے ہمارا مقصود یہ بتانا ہے کہ انسان کے پیدائشی مجرم ہونے کا تصوّر جو تھیاکریسی کی جان ہے انسانیت کے قافلہ کو خطرناک راہوں پر

---

[1] تاریخ اخلاق یورپ۔ ترجمہ از مولانا عبدالماجد دریابادی

لے گیا ۔ اس سے نہ صرف انفرادی زندگی پائمال ہوئی بلکہ معاشرتی اور سیاسی زندگی کی قدریں بھی یکسر بدل گئیں ۔ اس سے اگر انسان نے ایک طرف اپنی ذاتی سیرت سے زندہ دلی، خوش طبعی، صاف گوئی، فیاضی، شجاعت اور جرأت ایسی صفات عالیہ کو خارج کر دیا تو دوسری طرف معاشرتی زندگی کی بنیادیں بھی مسمار کر دیں ۔ لوگوں کے دلوں سے اپنے اعزہ اور اقارب کا احترام جس حیرت انگیز سرعت کے ساتھ مٹنے لگا اس کا عام ناظرین اندازہ نہیں کر سکتے ۔ ان لوگوں کی زندگی کا منتہائے نظر یہ ہوتا تھا کہ خود انہیں نجاتِ اخروی حاصل ہو انہیں اس سے کوئی غرض نہ تھی کہ ان کے متعلقین و متوسلین کا اُن کی غفلت اور قساوتِ قلبی سے کیا حشر ہو رہا ہے ۔ اس کا اندازہ مندرجہ ذیل دو مثالوں سے لگایا جا سکتا ہے :۔

> “ایک راہب صاحب کے پاس مدت دراز کے بعد اُن کے والدین کے خطوط دریافت کے لیے پہنچے ۔ حضرت کو یہ خیال گزرا کہ کہیں اُن کے پڑھنے سے میری یکسوئی خیال میں انتشار نہ پیدا ہو، اور اُن کو بے پڑھے آگ میں جھونک دیا ۔ ایک اور شخص کا قصہ مشہور ہے کہ اُسے راہب بننے کا شوق پیدا ہوا اور وہ ساری جائداد و املاک پر لات مار کے صرف اپنے ہشت سالہ بچہ کو ہمراہ لے کر خانقاہ کے دروازہ پر پہنچا ۔ راہبوں نے اس کا خیر مقدم کیا ۔ لیکن وہ ابھی اُسے اپنی جماعت میں کیونکر شریک کر سکتے تھے ۔ گو وہ اپنی دولت و ثروت کو بھول چکا تھا ۔ تاہم اولاد کی مامتا تو اس کے دل سے ابھی تک نہیں نکلی تھی ۔ اس خیال کی بنا پر اُس کا بچہ اُس سے لے لیا گیا ۔ کھانے، پہننے، چلنے، پھرنے غرض ہر شے سے متعلق اُس پر ہر طرح کی سختیاں برتی جانے لگیں اور ہر طرح کی ذلتوں اور سزاؤں کا اُسے شکار بنایا جانے لگا ۔ بیدرد اور اپنی نجات کا حریص، باپ روزمرہ یہ تماشہ دیکھتا لیکن کبھی مُنہ سے اُف تک نہ نکالتا تھا ۔ یہاں تک کہ ایک روز پیرِ خانقاہ کا اسے یہ حکم ملا کہ بچہ کو لے جا کر دریا میں ڈال دے[1] ۔

اس آدم بیزار اور مردم آزار اندازِ فکر سے نہ صرف معاشرتی زندگی متاثر ہوئی بلکہ قوموں کی سیاسی زندگی پر بھی اس نے نہایت ہی گھناؤنے اثرات پیدا کیے ۔ راہبوں کے اس گروہ نے بے شبہ کبھی حکومتوں

---

[1] تاریخ اخلاق یورپ ترجمہ از مولانا عبدالماجد دریا بادی ۔

کے خلاف براہ راست بغاوت نہیں کی تاہم وہ ہمیشہ لوگوں کو حکومت کی جانب سے برگشتہ یا کم از کم بے تعلق بناتے رہے اور علانیہ کہتے رہے کہ اُنہیں نظامِ حکومت، اور اسی قسم کی دنیاوی باتوں سے قطعاً کوئی سروکار نہیں کیونکہ حقیقی ترقی صرف اسی میں ہے کہ انسان اپنی جان پر زیادہ سے زیادہ جبر سہنے کی قوت پیدا کرے

ظاہر بات ہے کہ ان تصوّرات سے کسی تمدّن کی تخریب تو کی جاسکتی ہے مگر ان سے کسی تمدّن کی تعمیر کا کام نہیں لیا جاسکتا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جن لوگوں نے تمدّنی زندگی کی تعمیر کرنا چاہی، انہوں نے جب یہ دیکھا کہ رہبانیت ایک ایسا نظام پیش کرتی ہے جس کی فطرتِ انسانی متحمل نہیں ہوسکتی تو انہوں نے اس سے یکسر بغاوت کرکے تمدّن کی بنیادوں کو خالص مادّہ پرستانہ بنیادوں پر استوار کیا۔ اُن کی یہ روش فطرت کے عین مطابق تھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حسیّت دنیا میں اپنے اصول پر تمدّن قائم کرنے میں آسانی سے کامیاب ہوجاتی ہے۔ لیکن روحانیت خالصہ کے فلسفہ پر کسی محدود سے محدود رقبہ میں، چند لمحوں کے لیے بھی کوئی تمدّنی زندگی ظہور میں نہیں آسکتی۔ چنانچہ یہی ہؤا۔ تھیاکریسی کے زیرِ اثر جتنے ممالک تھے اُن سب میں بیک وقت معصیت و آزادی اور زہد و رہبانیت کی دو متقابل تحریکیں دوش بدوش چلنے لگیں۔ صحراؤں اور ویرانوں میں تو زہد و تقویٰ گوشہ نشین تھے اور شہروں میں فسق و فجور کی گرم بازاری تھی۔

یہ تو ہے تھیاکریسی کے نقشہ کے مطابق کسی قوم کی معاشرتی زندگی۔ سیاسی زندگی اس سے کہیں زیادہ خوفناک اور گھناؤنی ہے۔ برسرِ اقتدار طبقوں نے جب یہ دیکھا کہ ملک کے عوام تو راہبانہ شغل و ذکر اور زاہدانہ تعبد و استہلاک میں اس بُری طرح مشغول ہیں کہ اُنہیں نہ تو اپنے حقوق و فرائض کا ہوش ہے اور نہ ہی اپنے ابنائے جنس کا تو انہوں نے اس موقع کو غنیمت جان کر اپنے لیے عیش و آرام کے زیادہ سے زیادہ وسائل جمع کرنے شروع کیے۔ قیصر کا وہ حصّہ جو انہیں بغیر کسی کوشش اور جدوجہد کے خود بخود میسّر آچکا تھا۔ اُن کو مطمئن نہ کرسکا اور قوت و طاقت کے اس اندھے جوش میں انہوں نے ایک "آن دیکھے" خدا کے حصّہ کو ہتھیا لینے کا عزم کیا اور بالآخر کامیاب ہوئے۔ راستے کی ساری رکاوٹوں کو ختم کرچکنے کے بعد انہوں نے من مانی کارروائیاں شروع کیں۔ زندگی کے ہر میدان میں ناانصافی، زشت خواری

ودغابازی کا بازار گرم تھا مگر کسی "متقی" کے کان پر جوں تک نہ رینگتی۔ ظالم حاکموں کے ستائے ہوئے لوگوں کی فریاد آسمانوں تک پہنچ رہی تھی مگر کوئی زاہد اِن سے متاثر نہ ہوتا۔ عوام ہلاکت اور بربادی کے چنگل میں نہایت بُری طرح گرفتار تھے مگر کوئی "پارسا" ٹس سے مس نہ ہوتا۔ ان کی ساری دلچسپیاں "گلیم خویش" کو بچانے ک محدود ہو کر رہ گئیں۔ دنیا اور اس سے متعلقہ امور سارے کے سارے نہایت ہی بددیانت اور ذلیل قسم کے لوگوں کے ہاتھوں میں تھے۔ وہ جس طرح چاہتے ان معاملات کو طے کرتے اور کوئی ان پر گرفت کرنے والا نہ ہوتا۔

ان لوگوں میں شاید سب سے زیادہ مضحکہ خیز پوزیشن اُن فرمانرواؤں کی تھی جنہیں بعض وجوہ کی بنا پر روحانیت ور مادیت کے درمیان پیوند لگانا پڑا۔ یہ لوگ اپنی عبادت گاہوں میں تو پورے روحانی تھے لیکن بساطِ سیاست پر خالص مادی اور حسی تھے۔ اشوک جو ایک عقیدت مند اور پُرجوش بدھ تھا اور ساتھ ہی ساتھ یک زبردست فرمانروا اور کامیاب فاتح تھا اس طرزِ عمل کا ایک نمونہ ہے۔ قسطنطین نے جب مسیحیت قبول کی تو اُس نے بھی یہی دوعملی اختیار کی اور مسیحیت کی روحانیت کے ساتھ بت پرست روم کی مادیت ورجاہلیت کو جمع کیا۔ مگر یہ دوعملی زیادہ دیر تک کامیابی کے ساتھ چل نہ سکی۔ ان حکمرانوں کو روحانیت کو ترک رکے مادیت کے مسلک کو اختیار کرنا پڑا۔

پچھلی گذارشات پر غور کرنے کے بعد معلوم ہوگا کہ تھیاکریسی کے فلسفۂ زندگی نے حیاتِ انسانی میں جو نتائج پیدا کیے وہ یہ ہیں:-

● انسان کو پیدائشی مجرم گردانتے ہوئے اُسے اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ جابرانہ سے جابرانہ سیاسی نظام کا بھی خیر مقدم کرے کیونکہ اُس کی نجات اسی ظلم کو برداشت کرنے میں ہے۔

● زندگی اور اس کے مسائل سے فرار کو تقویٰ اور پرہیزگاری تصور کیا جانے لگا۔

● انسانی زندگی میں دو مختلف بلکہ متضاد تحریکیں چلنے لگیں جنہوں نے زندگی کی وحدت کو پارہ پارہ کر دیا۔

"تاریخ اخلاقِ یورپ" کا مصنف لیکی جس خوبی کے ساتھ اس صورتِ حالات کا نقشہ کھینچتا ہے وہ اس قابل ہے کہ اسے پیش کیا جائے، وہ کہتا ہے:-

> ” اخلاقی قوت یوں خواہ اس وقت کے مشرکوں کے زمانہ سے زائد ہو مگر جو کچھ تھی سب صحرا کی طرف منتقل ہو گئی تھی اور اس لیے دنیا میں اُس کا کوئی خاص اثر باقی نہیں رہا تھا۔ . . . جرأت و دلیری اور وطن پرستی کا نام و نشان بھی نہیں رہ گیا تھا اور خلقت میں رکاکت و پستی حد درجہ سرایت کر گئی تھی۔ دربار کی عیش پرستیاں، ارکانِ دربار کی غلام طینتی اور ملبوسات و زیورات کی تزئین و آرائش اپنے شباب پر تھیں۔ دنیا اس وقت انتہائی رہبانیت اور انتہائی بدکاری کے تھپیڑوں کے درمیان جھونکے کھا رہی تھی بلکہ بعض شہر جن میں سب سے زیادہ کثیر التعداد زُہّاد و راہبین پیدا ہوئے تھے، وہ وہی تھے جن میں عیش پرستی و بدچلنی کی سب سے زیادہ گرم بازاری تھی۔ غرض بدکاری اور توہم پرستی کا ایسا اجتماع ہو گیا تھا جو انسان کی شرافت و عظمت کا قطعی دشمن ہے۔ رائے جمہور اس قدر ضعیف ہو گئی تھی کہ لوگوں کو بدنامی و رسوائی کا مطلق خوف نہیں رہا تھا۔ البتہ ضمیر کا مذہب کو دھڑکا ہو سکتا تھا۔ لیکن اُسے بھی اس اعتقاد نے مٹا دیا تھا کہ دعاؤں وغیرہ سے سارے گناہ معاف ہو سکتے ہیں۔ مکّاری، دغابازی، دروغ گوئی کی وہ گرم بازاری تھی جو قیاصرہ کے زمانہ میں بھی نہ تھی[1]۔

آئیے اب ہم اس حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کریں کہ اسلام تھیاکریسی کے برعکس، اس کائنات اور انسان کے ساتھ اس کے تعلق اور رابطہ کو کس نگاہ سے دیکھتا ہے۔

اسلام جیسا کہ میں نے پہلے گذارش کی ہے انسان کے پیدائشی مجرم ہونے کے تصور کو سراسر باطل سمجھتا ہے اور فطرتِ انسانی کو فطرتِ الٰہی کے مطابق ٹھہراتا ہے[2]۔ (فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیھا) تھیاکریسی

---

[1] تاریخ اخلاق یورپ ترجمہ از مولانا عبدالماجد دریا بادی۔ ص ۱۴۳

[2] اسی خیال کی تائید میں پروفیسر لیکی لکھتا ہے:۔

”علماءِ مسیحیت کے ذہن میں انسان کے پُر معاصی ہونے کا تخیل بہت مبالغہ کے ساتھ سما گیا اور وہ معصیت کو انسان کی اصل سرشت سمجھنے لگے۔ اُنھوں نے اپنے نزدیک یہ سمجھ لیا کہ ہر انسان فطرتاً بدی کی طرف مائل ہے۔ اور نیکی کی تحریک اُس کے دل میں خاص اہتمام و کوشش کے بعد ہی

(باقی ص ۳۵ پر)

انسان کو جس قدر ذلیل اور رذیل خیال کرتی ہے، اسلام کے نقطۂ نظر کے مطابق وہ اتنا ہی سربلند ہے چنانچہ قرآن حکیم میں انسان کی عظمت اور سربلندی کے متعلق بیشمار آیات ملتی ہیں۔

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا۔ (۱۷: ۷۰)	ہم نے بنی آدم کو عزت بخشی اور ان کو خشکی اور تری میں سواریاں دیں اور ان کو پاک چیزوں سے رزق عطا کیا اور بہت سی ان چیزوں پر جو ہم نے پیدا کی ہیں ان کو ایک طرح کی فضیلت عطا کی ہے۔
اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْض	اے انسان کیا تو نہیں دیکھتا کہ اللہ نے ان سب چیزوں کو جو زمین میں ہیں تمہارے لیے مطیع بنا دیا ہے۔

ہ اور جانوروں کو پیدا کیا جن میں تمہارے لیے سردی سے حفاظت کا سامان ہے اور

بقیہ حاشیہ صفحہ سابق) پیدا ہونا ممکن ہے۔ حالانکہ یہ تخیل واقعات کے صریحاً خلاف ہے۔ ہم اپنے گرد و پیش کیا کیفیت پاتے ہیں؟ عموماً ہر شخص ہمدردی و انسانیت کو پسند، اور بے رحمی و شقاوت کو ناپسند کرتا ہے۔ خود غرضی، شہرت پرستی، رشک و حسد کو کوئی اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتا۔ دوسرے کے ساتھ بھلائی، اخوت و خدا ترسی کو سب پسند کرتے ہیں، منت پذیری و احسان شناسی کی مثالیں بکثرت ملتی ہیں اور احسان فراموشی کی خال خال۔ یہ وہ حالت ہے جو ہم اپنے مشاہدہ میں برابر ہر وقت پاتے رہتے ہیں۔ یہ انسان کی عام و طبعی حالت ہے، اس کے خلاف جو کچھ ہے وہ شاذ و غیر طبعی ہے۔ گویا یہ سمجھنا چاہیے کہ ہر سرشت انسانی کا سیدھا اور عام راستہ نیکی کا ہے اور اس میں افراط و تفریط کا نام معصیت ہے۔

لیکن یہ ضرور ہے کہ نفس بشری کی معصیت سرشتی کا یہ مبالغہ آمیز تخیل ابتدا کی دو تین صدیوں تک نہیں پیدا ہوا تھا۔ یہ زیادہ تر تیسری صدی عیسوی سے پھیلا۔ ورنہ شروع شروع میں تو ائمہ مسیحیت بھی گناہ کو انسان کی ایک غیر طبعی حالت سمجھتے تھے اور اسی بنا پر اس کو روکنے کی طرح طرح کی تدابیر اختیار کرتے تھے۔" (تاریخ اخلاق یورپ ترجمہ مولانا عبدالماجد دریابادی)

منفعتیں ہیں اور ان میں سے بعض کو تم کھاتے ہو۔ ان میں تمہارے لیے شان جمال ہے جب کہ تم صبح ان کو لے جاتے ہو اور شام کو واپس لاتے ہو۔ وہ تمہارے بوجھ ڈھو کر اس مقام تک لے جاتے ہیں جہاں تک تم بغیر جانکاہی کے نہیں جا سکتے۔ تمہارا رب بڑا مہربان اور رحم کرنے والا ہے۔ گھوڑے اور خچر اور گدھے تمہاری سواری کے لیے ہیں اور سامان زلیست ہیں۔ خدا اور بہت سی چیزیں پیدا کرتا ہے جن کا تم کو علم بھی نہیں ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہی ہے جس نے آسمان سے پانی اُتارا۔ اس میں سے کچھ تمہارے پینے کے لیے اور کچھ درختوں کی پرورش کے کام آتا ہے جن سے تم اپنے جانوروں کا چارہ حاصل کرتے ہو۔ اس پانی سے خدا تمہارے لیے کھیتی اور کھجور اور انگور اور طرح طرح کے پھل اُگاتا ہے، ان چیزوں میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر سے کام لیتے ہیں۔ اُسی نے تمہارے لیے رات اور دن اور سورج اور چاند اور تارے مسخّر کیے ہیں۔ یہ سب اسی خدا کے حکم سے مسخّر ہیں۔ ان میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں اور بہت سی وہ مختلف الالوان چیزیں جو اس نے زمین میں تمہارے لیے پیدا کی ہیں۔ ان میں سبق حاصل کرنے والوں کے لیے بڑی نشانی ہے اور وہ خدا ہی ہے جس نے سمندر کو مسخّر کیا کہ اس سے تم تازہ گوشت (مچھلی) نکال کر کھاؤ، اور زینت کے سامان (موتی وغیرہ) نکالو جن کو تم پہنتے ہو اور تو دیکھتا ہے کہ کشتیاں پانی کو چیرتی ہوئی سمندر میں بہتی چلی جاتی ہیں۔ چنانچہ سمندر کو اس لیے بھی مسخّر کیا ہے کہ تم لوگ اللہ کا فضل تلاش کرو (یعنی تجارت کرو) شاید کہ تم شکر بجالاؤ۔ اس نے زمین میں پہاڑ جما دیے کہ زمین تم کو لے کر لڑھک نہ جائے اور دریا اور راستے بنا دیئے کہ تم منزل مقصود کی راہ پاؤ۔ بہت سی علامات بنائیں منجملہ ان کے تارے بھی ہیں جن سے لوگ راستہ معلوم کرتے ہیں ۔ ۔ ۔ اور اگر تم خدا کی نعمتوں کا شمار کرو تو ان کو بے حساب پاؤ گے۔

(۱۶ : ۱-۲)

ان آیات میں انسان کو یہ بتایا گیا ہے کہ وہ دنیا کی ساری چیزوں سے ارفع اور اعلیٰ ہے اور یہ سب

اُسی کے فائدہ اور آرام کے لیے پیدا کی گئی ہیں۔ وہ ان سب پر فوقیت رکھتا ہے اور اسے ان کا مخدوم بنایا گیا ہے ۔

پھر اس انسان کو نہ صرف جانوروں اور دوسری حقیر چیزوں پر فضیلت حاصل ہے بلکہ بارگاہِ خداوندی کی سب سے مقرب مخلوق یعنی فرشتوں کو بھی اس کے سامنے جُھک جانے کا حکم دیا گیا تھا۔ قرآنِ حکیم نے انسان کی اس عظمت کو ان الفاظ میں پیش کیا ہے :-

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ
فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ط قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِیْهَا
مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَیَسْفِكُ الدِّمَآءَ وَ
نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ط
قَالَ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۔ وَعَلَّمَ
اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى
الْمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِیْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ
اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ۝ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ
لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ط اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِیْمُ
الْحَكِیْمُ ۔ قَالَ یٰٓاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ
فَلَمَّآ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ
لَّكُمْ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ غَیْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ
وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ۔
وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا
اِلَّآ اِبْلِیْسَ اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ
الْكٰفِرِیْنَ ۝ (البقرہ: ۲۹-۳۳)

اور جب کہ تیرے ربّ نے فرشتوں سے کہا کہ مَیں زمین میں اپنا ایک خلیفہ (نائب) بنانے والا ہوں تو انہوں نے عرض کیا کہ کیا زمین میں اُس کو نائب بناتا ہے جو وہاں فساد پھیلائے گا اور خونریزیاں کریگا۔ حالانکہ ہم تیری حمد کے ساتھ تیری تسبیح اور تیری تقدیس کرتے ہیں۔ اللہ نے فرمایا میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے ۔ اور اس نے آدم کو سب چیزوں کے اسماء سکھا دیئے پھر ان کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور کہا تم اگر سچّے ہو تو ان چیزوں کے نام مجھے بتاؤ۔ انہوں نے کہا پاک ذات ہے تیری، ہم اس کے سوا کچھ نہیں جانتے جو تو نے ہم کو سکھا دیا ہے تو ہی علم رکھنے والا ہے اور تو ہی حکمت کا مالک ہے۔ خدا نے کہا اے آدم ان فرشتوں کو انکے نام بتاؤ، پس جب آدم نے اُن کو ان اشیاء کے نام بتائے تو خدا نے کہا کہ کیا مَیں نے تم سے نہ کہا تھا کہ مَیں آسمانوں اور زمینوں کی سب مخفی باتیں جانتا ہوں اور جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو

اور چھپاتے ہو اس سب کا علم رکھتا ہوں؟ اور جب ہم
نے ملائکہ سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو اور ان سب نے سجدہ کیا
بجز ابلیس کے کہ اس نے انکار کیا اور تکبر کیا اور نافرمانوں میں
سے ہو گیا۔

اسی طرح سورۂ الحجر کے تیسرے رکوع میں فرمایا:۔

وَاِذۡ قَالَ رَبُّكَ لِلۡمَلٰٓئِكَةِ اِنِّىۡ خَالِقٌۢ
بَشَرًا مِّنۡ صَلۡصَالٍ مِّنۡ حَمَاٍ مَّسۡنُوۡنٍ ۝
فَاِذَا سَوَّيۡتُهٗ وَنَفَخۡتُ فِيۡهِ مِنۡ رُّوۡحِىۡ
فَقَعُوۡا لَهٗ سٰجِدِيۡنَ ۔ فَسَجَدَ الۡمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمۡ
اَجۡمَعُوۡنَ ۙ اِلَّاۤ اِبۡلِيۡسَ ؕ اَبٰٓى اَنۡ يَّكُوۡنَ مَعَ
السّٰجِدِيۡنَ ۔ قَالَ يٰٓاِبۡلِيۡسُ مَا لَكَ اَلَّا تَكُوۡنَ
مَعَ السّٰجِدِيۡنَ ۔ قَالَ لَمۡ اَكُنۡ لِّاَسۡجُدَ لِبَشَرٍ
خَلَقۡتَهٗ مِنۡ صَلۡصَالٍ مِّنۡ حَمَاٍ مَّسۡنُوۡنٍ ۝
قَالَ فَاخۡرُجۡ مِنۡهَا فَاِنَّكَ رَجِيۡمٌ ۙ وَّاِنَّ
عَلَيۡكَ اللَّعۡنَةَ اِلٰى يَوۡمِ الدِّيۡنِ

اور جب کہ تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں ایک
کالے سڑے ہوئے سوکھے گارے سے ایک بشر بنانے
والا ہوں پھر جب میں اس میں اپنی روح میں سے کچھ
پھونک دوں تو تم اس کے لیے سربسجود گر جانا، چنانچہ تمام
فرشتوں نے سجدہ کیا: بجز ابلیس کے کہ اس نے سجدہ کرنے
والوں میں شامل ہونے سے انکار کر دیا۔ خدا نے کہا ابلیس!
تجھے کیا ہو گیا کہ تو سجدہ کرنے والوں میں شامل نہیں ہوتا۔
ابلیس نے کہا کہ میں ایسا نہیں ہوں کہ اس بشر کو سجدہ
کروں جسے تو نے کالے سڑے ہوئے سوکھے گارے
سے بنایا ہے۔ خدا نے کہا تو جنت سے نکل جا کہ تو راندۂ
درگاہ ہے اور یوم جزا تک تجھ پر پھٹکار ہے۔

اس مضمون کو قرآن پاک میں مختلف طریقوں سے دہرایا گیا ہے اور ان سب کا خلاصہ یہ ہے کہ خداوند تعالیٰ کے نزدیک انسان کی عظمت، بشرطیکہ وہ صحیح معنوں میں خدا کا فرمانبردار ہو، فرشتوں سے کہیں بڑھ کر ہے۔ خداوند تعالیٰ نے مٹی کے اس پتلے کو نوری مخلوق سے زیادہ علم عطا کیا، اس کے علم کو فرشتوں کی تسبیح و تقدیس پر ترجیح دی، انہیں حکم دیا کہ میرے اس نائب کو سجدہ کرو۔ چنانچہ فرمانِ خداوندی کے تحت سب کے سب بجز ابلیس کے اس کے سامنے سجدہ ریز ہو گئے۔ یہ اس حقیقت کی شہادت ہے

کہ ملکوتیت بھی انسان کے سامنے عاجز ہے۔ انسان اپنی خلقت کے لحاظ سے تو بلاشبہ مٹی کا ایک حقیر پُتلا ہے مگر خدا نے اس میں جو روح پھونکی تھی اور اُس کو جو علم بخشا تھا اُس نے اسے سربلند کیا، اور اسی بنا پر فرشتوں نے اس کی فضیلت کو تسلیم کر لیا اور اس کے آگے جھک گئے۔

مگر یہاں اس حقیقت کو فراموش نہ کرنا چاہیے کہ خداوند تعالیٰ نے انسان کو خلیفہ کہہ کر اُس کے دل و دماغ سے اپنی خود مختاری اور اللہ کی اس سلطنت میں حکومتِ خود اختیاری کا جذبہ اور خیال، جو شر و فساد، نزاع اور تصادم کا سب سے بڑا سرچشمہ ہے، نکال دیا ہے۔ اُسے یہ سمجھا یا گیا کہ اگرچہ زمین و آسمان کی ساری چیزیں اُسی کے لیے پیدا کی گئی ہیں مگر ان کے استعمال میں وہ بالکل آزاد نہیں۔ اُسے اُن سے استفادہ کرنے میں خداوند تعالیٰ کی راہنمائی اور خوشنودی کو پیشِ نظر رکھنا چاہیے۔ اور اگر وہ اس طرح عمل نہیں کرتا تو وہ نائبِ خدا نہیں بلکہ باغی اور سرکش ہے اور اس لحاظ سے خدا کی امانت میں خیانت کرنے والا ہے۔ اُس کی وفاداری کا تقاضا یہ ہے کہ وہ خداوند تعالیٰ کی عطا کردہ املاک، اس کی رعیت اس کے نوکروں، اس کے خادموں اور اس کے غلاموں پر حکومت کرنے، ان سے خدمت لینے، ان پر تصرف کرنے اور ان کی نگرانی کرنے میں اس کے بنائے ہوئے قوانین پر کاربند ہو۔ اگر وہ ایسا نہیں کرے گا تو وہ سخت مجرم ہے، پسندیدہ نہیں مردود ہے، مستحقِ انعام نہیں مستوجبِ سزا ہے۔

پھر قرآنِ حکیم نے نہایت ہی بلیغانہ انداز میں اُس کی نیابت کی اصل غرض کی بھی وضاحت فرما دی ہے:

وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰىكُمْ۔ (۶ : ۲۰)	وہ اللہ ہی ہے جس نے تم کو زمین میں نائب بنایا اور تم میں سے بعض کو بعض سے اونچے درجے دیے تاکہ جو کچھ اس نے تم کو دیا ہے اس میں تمہاری آزمائش کرے۔
قَالَ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّهْلِكَ عَدُوَّكُمْ وَيَسْتَخْلِفَكُمْ فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ (۷ : ۱۴)	موسیٰ نے بنی اسرائیل سے کہا قریب ہے کہ خدا تمہارے دشمن کو ہلاک کرے اور تمہیں زمین کی خلافت دے تاکہ دیکھے کہ تم کیسے عمل کرتے ہو۔

يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اِنَّ الَّذِيْنَ يَضِلُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌۢ بِمَا نَسُوْا يَوْمَ الْحِسَابِ ۔

اے داؤد۔ ہم نے تجھ کو زمین میں اپنا نائب بنایا ہے۔ پس تو لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ حکومت کر اور اپنی خواہشِ نفس کی پیروی نہ کر کہ یہ تجھے اللہ کے راستے سے بھٹکا دے گی۔ جو لوگ اللہ کے راستے سے بھٹک جاتے ہیں ان کے لیے اس بنا پر سخت عذاب ہے کہ وہ حساب کے دن کو بھول جاتے ہیں۔

یہ آیات اس حقیقت کی آئینہ دار ہیں کہ اس کائنات میں انسان کو خلافت کا جو منصب عطا ہوا ہے وہ دراصل خداوند تعالیٰ کی طرف سے ایک آزمائش ہے کہ وہ یہ دیکھے کہ انسان اس منصب کی نازک ذمہ داریوں سے کس طرح عہدہ برآ ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں جا بجا اس کی نسبت بوضاحت ذکر ملتا ہے:۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ۔

ہم نے انسان کو بہترین اندازہ پر بنایا پھر اُسے سب سے نچلے درجے میں پھینک دیا سوائے اُن کے جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک کام کیے سو اُن کے لیے بے انتہا اجر ہے۔

یعنی انسان حقیقت میں نیک نہاد ہے اور اس کی شرافت و فضیلت مسلم ہے لیکن بُرے اعمال کی وجہ سے اس کا ازلی کمال زائل ہو جاتا ہے۔ انسان اپنی خلقت کے اعتبار سے نہایت بلند ۔۔ اس قدر بلند ہے کہ جس امانت کا بوجھ آسمان اور زمین نے اُٹھانے سے انکار کیا اُسے انسان نے جوش و وجدان میں قبول[1] کر لیا اور اس طرح نادانستہ طور پر کائناتِ ہستی میں اپنی فضیلت ثابت کر دی[2]۔

امام غزالیؒ اور علامہ بیضاویؒ (خدا انہیں کروٹ کروٹ جنّت عطا کرے) نے اس آیت کی

---

[1] آیۂ کریمہ اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ

[2] اسلامی الٰہیات کی جدید تشکیل صـ ۹۰

تفسیر میں لکھا ہے کہ :۔

"امانت سے مراد ذمہ داری اعمال کا قبول کرنا ہے، یا یُوں کہیے کہ ثواب یا عذاب کے لیے آمادگی کا اظہار کرنا جو بالترتیب اس کی اطاعت اور عصیان کا نتیجہ ہے۔ پیش کرنے کے معنی یہ ہیں کہ اس ذمہ داری اور ان کی استعداد کا باہم موازنہ کیا۔ انکار سے مراد طبعی انکار ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ ان اشیا نے اپنے اندر یہ استعداد نہ پائی کہ اس ذمّہ داری کو قبول کریں انسان کے اس امانت کو اُٹھانے کے یہ معنی ہیں کہ اس میں یہ استعداد موجود ہے اور اس لیے وہ اس قابل ہے کہ اس کو اپنے اعمال کا ذمّہ دار گردانا جائے"

حکیم الامت حضرت شاہ ولی اللہ (اللہ اُن پر اپنی خاص رحمت فرمائے) اسی نکتہ کی وضاحت میں ارشاد فرماتے ہیں :۔

"مَیں کہتا ہوں کہ اگر یہ معنی اور یہ تفسیر صحیح ہے (جو یقیناً صحیح ہے) تو پھر اللہ تعالیٰ کا یہ فرمانا کہ انسان بڑا ظالم اور جاہل ہے ۔انسان کی استعداد پر دلالت کرتا ہے، کیونکہ ظالم اُسی کو کہتے ہیں جو عدل پر قائم رہنے کی استعداد رکھنے کے باوجود، اس سے انحراف کرتا ہے (کانٹوں میں اگر آدمی اُلجھ جائے تو کبھی یہ نہیں کہا جائے گا کہ کانٹوں نے ظلم کیا۔ ان میں عدل لور ظلم کی استعداد ہی نہیں۔ جو اثر ان سے ظاہر ہوتا ہے وہ محض طبعی طور پر ان سے ظہور میں آتا ہے) اسی طرح جاہل اس کو کہتے ہیں جو علم حاصل کرنے کی استعداد رکھتا ہو اور اس کے باوجود اس دولت سے محروم رہے (چنانچہ دیوار کو جاہل نہیں کہیں گے) اب ظاہر ہے کہ انسان ہی ایک ایسی مخلوق ہے جس میں علم حاصل کرنے اور عدل کرنے کی استعداد رکھی گئی ہے"

یہی وہ اصل وجہ ہے جس کی بدولت اُسے فضیلت و عظمت عطا ہوئی۔ اور اسی سے اس میں اتنا اعتماد پیدا ہُوا کہ نہ صرف حقائق اشیا کا علم حاصل کرے بلکہ اپنی ضروریات کے مطابق فطرت میں

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ ۔

تصرّف بھی کرسکے[۱]

ظاہر بات ہے کہ یہ مقصد اس کائنات، اور اس میں خداوند تعالیٰ کی نعمتوں سے مُنہ موڑ کر پورا نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ انسان ان سے پُوری طرح فائدہ تو اُٹھائے مگر ان میں گم ہو کر نہ رہ جائے۔ تھیاکریسی میں تقویٰ کا معیار یہ ہے کہ انسان اس دنیا اور اس کے جملہ مسائل سے بے رغبتی اور بے تعلقی اختیار کر کے خداوند تعالیٰ کی رضا تلاش کرے۔ اس کے برعکس اسلام یہ کہتا ہے کہ نیکی دنیا کو ترک کر دینے میں نہیں بلکہ یہ ہے کہ انسان اس دنیا میں رہتے ہوئے خدا کی نعمتوں سے بھرپور استفادہ کرنے میں اُس کی خوشنودی کو ملحوظ خاطر رکھے۔

چنانچہ قرآن حکیم میں بڑی صراحت سے کہا گیا ہے :۔

یٰاَیُّهَا النَّاسُ کُلُوْا مِمَّا فِی الْاَرْضِ حَلٰلًا	اے لوگو! جو کچھ زمین میں حلال اور پاک ہے اس
طَیِّبًا وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ۔ اِنَّهٗ	میں سے کھاؤ اور شیطان کی پیروی نہ کرو کہ وہ تمہارا
لَکُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ۔ اِنَّمَا یَاْمُرُکُمْ بِالسُّوْٓءِ وَ	کھلا دشمن ہے۔ وہ تو تمہیں بدی اور بے حیائی اور
الْفَحْشَآءِ وَاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَی اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ	خدا کے بارے میں ایسی باتیں کرنے کا حکم دیتا ہے جو
(۲ : ۲۱) ۔	تم نہیں جانتے۔

---

[۱] علامہ اقبال مرحوم نے اپنی کتاب بالِ جبریل میں وہ منظر بیان کیا ہے جب کہ فرشتے آدم کو جنت سے رخصت کر رہے تھے۔ فرشتوں کی زبان پر انسانی فضیلت کا یہ گیت تھا :۔

عطا ہوئی ہے تجھے روز و شب کی بیتابی — خبر نہیں کہ تو خاکی ہے یا کہ سیمابی
سُنا ہے خاک سے تیری نمود ہے لیکن — تری سرشت میں ہے کوکبی و مہتابی
جمال اپنا اگر خواب میں بھی تو دیکھے — ہزار ہوش سے خوشتر تری شکر خوابی
گراں بہا ہے ترا گریۂ سحر گاہی — اسی سے ہے ترے نخلِ کہن کی شادابی

تری نوا سے ہے بے پردہ زندگی کا ضمیر
کہ تیرے ساز کی فطرت نے کی ہے مضرابی

يَا يُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ۔ وَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا وَّاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اَنْتُمْ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ (۵ : ۱۲)	اے ایمان لانے والو! جو پاک چیزیں اللہ نے تمہارے لیے حلال کی ہیں اُن کو اپنے اوپر حرام نہ کرو، اور حد سے نہ گزرو کہ اللہ حد سے گزرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ اور ان پاک اور حلال چیزوں میں سے کھاؤ جو اللہ نے تمہیں عطا کی ہیں اور اس خدا کے غضب سے ڈرو جس پر تم ایمان رکھتے ہو۔
قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ (۷ : ۴)	کہو کہ کس نے اللہ کی اس زینت اور پاکیزہ روزی کو حرام کیا ہے جو اللہ نے اپنے بندوں کے لیے نکالی ہے۔
رُهْبَانِيَّةَ ۨ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ اِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ ۔	اور رہبانیت کا طریقہ جو مسیح کے پیروؤں نے خود نکال لیا تھا۔ وہ ان پر ہم نے لازم نہیں کیا تھا۔ ہم نے صرف رضائے الٰہی کے حصول کا حکم دیا تھا۔
لا رهبانيةَ في الاسلام	اسلام میں رہبانیت نہیں
لا صرورةَ في الاسلام	اسلام میں تجرّد نہیں

خداوند تعالیٰ کا یہ فرمان اور نبی آخرالزمان کی تصریحات اس حقیقت کی شاہد ہیں کہ اسلام کی نظر میں رفعتِ اخلاق یہ نہیں کہ انسان اس دنیا کو چھوڑ دے، اس کی لذتوں اور زینتوں کو اپنے اوپر حرام کر لے۔ اس کے برعکس اُسے یہ بات ذہن نشین کرائی گئی ہے کہ یہ دنیا انسان ہی کے لیے بنائی گئی ہے اور اس لیے اس کا فرض یہ ہے کہ اُس کو برتے اور خوب برتے۔ مگر بُرے اور بھلے، حق و ناحق کو جان کر برتے۔ خدا نے اُسے شعور اور آگہی کی جو قوتیں عطا کی ہیں، اُن سے کام لے اور اپنے عمل سے ثابت کر دے کہ وہ ترغیبات کے ہجوم میں رہتے ہوئے بھی خدا کی یاد سے غافل نہیں ہوا۔ یہ دنیا دارالعمل ہے، اور اس میں جو شخص اپنے باعمل ہونے کا ثبوت پیش نہیں کرتا وہ اپنے مقصدِ تخلیق کو بالکل ضائع کر دیتا ہے۔

اسلام میں بندگی صرف کسی غار میں بیٹھ کر ذکر و اذکار میں انہماک نہیں بلکہ یہاں زندگی کی کشاکش، بازاروں کے شور و شغب اور کاروبار کی مصروفیت میں رہ کر خدا کو نہ بھولنا اصل عبادت ہے۔

رِجَالٌ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ
عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَاءِ الزَّكٰوةِ
يَخَافُوْنَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيْهِ الْقُلُوْبُ وَالْاَبْصَارُ

وہ جوانمرد جن کو تجارت اور خرید و فروخت اللہ کی یاد اور نماز کے قیام اور زکوٰۃ کی ادائی سے غافل نہیں کرتی وہ اس دن سے ڈرتے ہیں، جس میں دل اور نگاہیں پلٹ جائیں گی۔

یہاں صرف خدا کی یاد اور اس کی عبادت پر اکتفا نہیں بلکہ نماز کے بعد کسب معاش، حصول رزق اور محنت و تجارت کی بھی ترغیب ہے۔ اور انہیں بھی فرائض میں شامل کیا گیا ہے

فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا
فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ ۔

جب نماز ختم ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ۔ اور اللہ کے فضل کی تلاش کرو۔

یہی وجہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ریاضت کو بھی پسند نہیں کیا جس میں انہماک انسان کو اس کے دنیاوی حقوق فراموش کرا دے۔ چنانچہ آپ نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو جو مسلسل روزہ رکھتے تھے اور رات رات بھر نمازیں پڑھتے تھے یہ نصیحت فرمائی:۔

فان لجسدك عليك حقا وان لعينك
عليك حقًا وان لزوجك عليك حقا
صُمْ وافطر ۔

تم پر تمہارے جسم کا بھی حق ہے۔ تمہاری آنکھوں کا بھی حق ہے۔ تمہاری بیوی کا بھی حق ہے۔ کسی دن روزہ رکھو کسی دن نہ رکھو۔

اسلام کائنات اور زندگی کے متعلق جو مخصوص نقطۂ نظر رکھتا ہے۔ اس کا اثر زندگی کے ہر پہلو پر نمایاں ہے۔ تھیاکریسی نے انسانی زندگی کو دو مختلف شعبوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ ایک خدا کا اور دوسرا قیصر کا، اور ان دونوں کا آپس میں کوئی میل نہیں۔ نیکی، راست بازی، اور صالحیت صرف خدا کے لیے ہیں۔ باقی رہے امور دنیا تو ان میں انسان کو پوری آزادی ہے۔ وہ جس طرح چاہے عمل کرے۔ اسی وجہ سے تھیاکریسی نے عبادت کا جو نظریہ پیش کیا ہے وہ یہ ہے کہ یا تو انسانوں کا ایک مخصوص گروہ صرف پوجا پاٹ کے لیے

اپنے آپ کو وقف کر دے، یا جماعت کا ہر فرد اپنے اوقات میں سے تھوڑا سا وقت خدا کے ذکر کے لیے نکالے اور پھر سمجھ لے کہ اُس نے خدا کا حق ادا کر دیا ہے۔ اسلام اس تصورِ عبادت، اور دین اور دنیا کی اس تفریق کو سراسر باطل سمجھتا ہے۔ اُس کا انسان سے مطالبہ یہ ہے کہ اُس کی ساری زندگی، اُس کے سارے اوقات ایک خدا کی چاکری میں گزریں۔ وہ اپنے آپ کو دائمی اور ہمہ وقتی ملازم سمجھے، اور اُس کی اِس حیاتِ مستعارہ کا ہر لمحہ اُسی کی عبادت میں صرف ہو۔ اُس کا سونا، جاگنا، اُس کا کھانا پینا، اس کا چلنا پھرنا، غرض اُس کے سارے افکار و اعمال سب کے سب خدا کے قانونِ شرعی کے پابند ہوں۔ اُسے اپنی نجات کے لیے کسی خلوت کدے میں گوشہ نشینی، یا کسی سنسان جنگل میں چلّہ کشی کی ضرورت نہیں۔ اُس کی فلاح کا مدار اس بات پر ہے کہ وہ حیاتِ اجتماعی[1] سے بھاگ کر نہیں بلکہ اس کے منجدھار میں

---

[1] یہاں ایک غلط فہمی کا ازالہ کر دینا نہایت ہی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ حیاتِ اجتماعی کی اہمیت جو کچھ اسلام میں ہے اُس سے ذہن اُس فلسفہ کی طرف منتقل نہ ہو جانا چاہیے جس کی رُو سے فرد کی انفرادی حیثیت کو نظر انداز کر کے اُس کی ذات کو محض جماعت کی خاطر اہمیت دی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر اشتمالیّت اور ڈکٹیٹر شپ۔ اسلام کا نقطۂ نظر اس سے اتنا ہی دُور ہے جتنا کہ رہبانیت سے۔ یہاں نوعِ انسانی کا ایک ایک فرد اپنی انفرادی حیثیت میں خدا کے سامنے جواب دہ ہے۔ قرآنِ حکیم میں مختلف مقامات پر اس کی اہمیت بتلائی گئی ہے۔ مثلاً:-

عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ (۵ : ۱۴)	تم پر تمہارے اپنے نفس کی ذمہ داری ہے، اگر تم ہدایت پاؤ تو دوسرا گمراہ ہونے والا تم کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔
وَمَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَيْهَا وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى (۶ : ۳)	ہر نفس جو کچھ کماتا ہے اس کا بوجھ اسی پر ہے۔ کوئی کسی کا بوجھ نہیں اٹھاتا۔
اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ وَاِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا (۱۷ : ۱)	اگر تم نیک کام کرو گے تو اپنے نفس کے لیے کرو گے اور اگر بُرے کام کرو گے تو اسی کے لیے۔

اِن تصریحات کے باوجود حیاتِ اجتماعی پر جو زور دیا گیا ہے وہ اس وجہ سے ہے کہ (باقی اگلے صفحہ پر)

رہ کر اپنے خالق سے اپنی محبت اور وفاداری کا ثبوت پیش کرے۔ اُس کی نجات کا راز فرار میں نہیں بلکہ اس میں ہے کہ وہ ہر قسم کے دنیاوی تعلقات میں بندھ کر، ان ذمّہ داریوں اور امانتوں کے بوجھ سے لدکر خوف اور لالچ، بیم اور رجا کے ماحول میں رہ کر، اپنے پیدا کرنے والے کے منشا کو پورا کرے۔ اسلام نے روحانی ترقی اور خدا کی یافت کا جو راستہ بتایا ہے وہ یہ ہے کہ خدا اس کو انسانوں کے درمیان، دنیوی زندگی کے ہنگامۂ کارزار میں ملے گا۔ اور جو شخص اپنے خالق کو انسانی بستیوں میں نہیں، بلکہ جنگلوں اور ویرانوں میں تلاش کرتا ہے وہ اپنی کوششوں کو خود اپنے ہاتھ سے برباد کرتا ہے۔ یہاں قیصر کا کوئی حصّہ نہیں بلکہ سارے کا سارا حصّہ صرف خدا کا ہے اور اس میں اگر وہ کسی کو شریک کرتا ہے تو وہ شرک ایسے جرم کا ارتکاب کرتا ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ اسلام کا سب سے بڑا کارنامہ یہی ہے کہ اُس نے دین اور دنیا کی تفریق کو مٹا دیا ہے۔ مسلمان جب بھی دعا مانگتا ہے تو یہی کہتا ہے:۔

رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّ فِی	اے ہمارے پروردگار ہم کو دنیا میں بھی بھلائی عطا کر
الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ	اور آخرت میں بھی، اور ہم کو جہنم کی آگ سے بچا۔

سرورِ دو عالم نے اس حقیقت کو ایک دوسرے انداز میں اس طرح پیش فرمایا ہے۔

جُعِلَتْ لِی الارض مسجدًا	میرے لیے تمام زمین مسجد بنائی گئی ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مختصر سے جملہ میں حیاتِ انسانی کے اس راز کو آشکارا کیا ہے کہ یہ زندگی ایک وحدت ہے جسے کسی طور پر بھی مختلف خانوں میں نہیں بانٹا جا سکتا۔ اس لحاظ سے دین اور دنیا کی تقسیم بالکل غلط ہے، اسلام کے نزدیک تمام دنیاوی اعمال خالص دینی نوعیت رکھتے ہیں۔ انسانی عمل کی کوئی شق، اخلاقی اور دینی عنصر سے خالی نہیں ہو سکتی۔ اس لیے دنیاوی مسائل کو حل کرنے کا سب سے بہترین طریقہ یہ ہے کہ انہیں احکامِ الٰہی کے مطابق حل کیا جائے۔ لہٰذا یہ کہنا کہ دنیاوی اعمال ادنیٰ

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابق) خداوند تعالیٰ کے سامنے انسان کی جواب دہی بڑی حد تک اجتماعی حقوق، فرائض اور ذمہ داریوں سے متعلق ہے اور انسان کے لیے اپنی انفرادی ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہونے کے لیے ضروری ہے کہ وہ اجتماعی ذمہ داریوں سے اچھی طرح عہدہ برا ہو۔

مقاصد کے حامل ہوتے ہیں اور اس وجہ سے نیک اور پاکباز انسانوں کو ان سے پرہیز کرنا چاہیے، اسلام کے نزدیک سراسر جہالت ہے۔ یہاں ایک ہی نقطۂ نظر ہے جو مسجد سے لے کر بازار اور میدانِ کارزار تک، طریقِ عبادت سے لے کر طرزِ معاشرت تک، اجتماعیات، معاشیات، سیاسیات اور بین الاقوامی تعلقات کے پیچیدہ سے پیچیدہ اور اہم سے اہم مسائل تک سب پر حاوی ہے۔ تھیاکریسی کی تعلیم صرف انسان اور خدا[1] کے باہمی تعلق تک محدود ہے، یہاں انسان اور انسان کے باہمی رابطہ کو ایک دنیاوی معاملہ خیال کرتے ہوئے مذہب سے بے تعلق سمجھا گیا ہے۔ اسلام اس کے برعکس جس قدر خدا اور انسان کے تعلق سے بحث کرتا ہے، اسی قدر انسان اور انسان کے تعلق، انسان اور کائنات کے تعلق سے بھی بحث کرتا ہے اور نوعِ انسانی کو بتاتا ہے کہ اُسے اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی تعمیر کس نقشہ کے مطابق کرنی چاہیے کیونکہ اس کے نزدیک ان دونوں کے باہمی ربط اور ہم آہنگی سے ہی انسانی زندگی درست ہوسکتی ہے اور اسی پر اُس کی فلاح کا مدار ہے۔ اس طرح ایک دوسرے سے ان کا تعلق تکمیل و تصحیح کا ہے، تباین و تضاد کا نہیں۔

زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح حکومت اور سیادت بھی اس کے محتاج ہیں کہ انہیں اسلام کے قوانین کے مطابق ڈھالا جائے اور اس طرح اس زمین پر ظلم و عدوان کی بجائے عدل، فتنہ و فساد کی بجائے امن، سرکشی و خونریزی کی بجائے باہمی محبت و وفاکیشی کا غلبہ ہو۔ اس لیے خدا کے پاکباز اور صالح بندوں پر فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اقتدار کی باگیں اپنے ہاتھ میں لے کر ملک و دین کی دوئی کو ختم کرکے زندگی کی فطری وحدت کو قائم و برقرار رکھیں۔ تمدّن کا صحیح توازن اسی وقت تک قائم رہ سکتا ہے جبکہ امورِ مملکت کو بھی اسی نظامِ حیات کا پابند کیا جائے جس کی پابندی کہ ایک فرد اپنی انفرادی زندگی میں کرتا ہے انسانی فطرت اجتماعی زندگی کی متقاضی ہے، انسانوں کے ذہنی اور اخلاقی قویٰ اس وقت تک نشو و نما نہیں پا سکتے جب تک عدل و انصاف کو نافذ کرنے کے لیے کوئی ایسا ادارہ موجود نہ ہو جو مفادِ کلّی کی نگہداشت کرسکے۔ تھیاکریسی کے نزدیک حکومت کو انسانی سیرت و سرشت کے عیب نے جنم دیا ہے، اور اس وجہ

---

[1] سینٹ تھریسا دعا مانگا کرتی تھی کہ کاش ساری کائنات ناپید ہو جائے اور اکیلی میں موجود ہوں تاکہ آقا کی خدمت گذاری کا فخر تنہا مجھی کو حاصل ہو۔

سے اس کے ظالمانہ رویہ کو بخوشی برداشت کرنا انتہائی سعادت ہے۔ اس کے برعکس اسلام حکومت کو انعام سمجھ کر "صالحین" کے لیے اس کا حصول لازم قرار دیتا ہے، کیونکہ اسی کی مدد سے دنیا سے فساد آسانی سے مٹایا جا سکتا ہے۔ یہاں استبدادیت کے سامنے سپر ڈال دینے کی بجائے اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ ظلم وعدوان مالک ارض وسمٰوات کے منشا کے خلاف ہیں۔ اس لیے ایک مسلم کا یہ فرض ہے کہ انہیں جلد از جلد دنیا سے مٹانے کی سعی کرے۔ اسلام تو نام ہے اس یقین انگیز، ایمان پرور اور باطل شکن تحریک کا جس میں انسان ہر غیر الٰہی ظالمانہ نظام کو ختم کر کے رضائے الٰہی کے مطابق ایک پُرامن نظام کی نیو ڈالتا ہے۔ چنانچہ قرآنِ حکیم میں ارشاد ہوتا ہے :۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا	تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل
الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِی الْاَرْضِ كَمَا	کیے اُن سے اللہ نے وعدہ کیا ہے کہ ان کو یقیناً زمین
اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَیُمَكِّنَنَّ لَهُمْ	خلیفہ بنائے گا، جس طرح ان سے پہلے کے لوگوں کو
دِیْنَهُمُ الَّذِی ارْتَضٰی لَهُمْ وَلَیُبَدِّلَنَّهُمْ	بنایا جا چکا ہے۔ اور ضرور ان کے دین کو جسے اس نے ان
مِنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا یَعْبُدُوْنَنِیْ وَلَا	کے لیے پسند کیا ہے مضبوطی کے ساتھ قائم کرے گا اور
یُشْرِكُوْنَ بِیْ شَیْئًا ۔ (نور ـ ۷)	بالیقین ان کی حالتِ خوف کو امن سے بدل دیگا پس

وہ میری عبادت کریں اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں۔

اسی استخلاف[1] فی الارض کے متعلق ایک اور جگہ ان الفاظ میں تذکرہ کیا گیا ہے :۔

---

[1] یہ ایک بڑا ہی نازک مقام ہے جس سے ملت اسلامیہ میں بےشمار غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں۔ ایک گروہ کا خیال یہ ہے کہ مذہب کو دنیوی سربلندی کا ذریعہ نہ بنایا جائے۔ اس کے متعلق صرف اتنا عرض کر دینا کافی ہے کہ اسلامی نظام کے غلبہ کی تمنا دنیوی اقتدار کی ہوس سے بالکل ایک مختلف چیز ہے اور ان دونوں کو خلط ملط کر کے ان پر ایک ہی حکم صادر کر دینا سخت غلطی ہے۔ ایک دوسرا گروہ ان الارض یرثہا عبادی الصالحون سے ایک شدید گمراہی کا شکار ہوتا ہے۔ اُس نے یہ سمجھ کر کہ زمین صالح لوگوں کی میراث ہے یہ نتیجہ اخذ کر لیا کہ ہر وہ قوم یا گروہ جسے دنیا میں اقتدار حاصل ہے وہ صالح ہے۔ ایک معمولی سمجھ بوجھ رکھنے والا مسلمان بھی

(باقی بر صفحہ آئندہ)

إِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَآءُ مِنْ	بیشک زمین اللہ کی ہے۔ وہ اپنے بندوں میں جس کو
عِبَادِهٖ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ۔	چاہے اس کا وارث کر دے اور آخری کامیابی ڈرنے
	والوں کے لیے ہے۔

اسلام کے نزدیک حکومت اور مملکت اللہ کا ایک ایسا انعام ہے جس کے حاصل ہونے پر حضرت یوسف علیہ السلام جیسے جلیل القدر پیغمبر کی زبانِ مبارک سے یہ الفاظ نکلے۔

رَبِّ قَدْ اٰتَيْتَنِيْ مِنَ الْمُلْكِ وَعَلَّمْتَنِيْ	پروردگار تو نے مجھے حکومت عطا فرمائی اور باتوں کا مطلب
مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَ	اور نتیجہ نکالنا سکھایا۔ اسے آسمان و زمین کے بنانے
الْاَرْضِ اَنْتَ وَلِيّٖ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ	والے! تو ہی میرا کارساز ہے، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابق)، اس حقیقت سے واقف ہے کہ جو لوگ اپنے شخصی، یا خاندانی یا قومی اقتدار کے لیے جدوجہد کریں اور اس کے نتیجہ میں اگر انہیں اقتدار نصیب ہو جائے تو یہ وہ انعام نہیں جو دینداری کے نتیجہ میں حاصل ہوا کرتا ہے۔ بلکہ یہ خالص دنیا پرستی کے نتیجہ میں حاصل ہونے والا اسراب قوت و عیش ہے جس سے کل کے نمرود، اور آج کے انگریز، امریکن اور روسی بہرہ ور ہیں۔ اب اگر کوئی شخص ان کو بھی صالح سمجھتا ہے تو اس سے بڑی گمراہی کیا ہو سکتی ہے۔ اس طرزِ استدلال میں جو غلطی ہے اُسے سمجھنے کے لیے فرض کیجیے کہ ایک گاؤں میں ڈاکوؤں کے حملہ کا شدید خطرہ ہے۔ اور حملہ آور ہر قسم کے اسلحہ سے پوری طرح مسلح ہیں۔ حکومت کے کارندوں نے اس دیہات کے رہنے والوں سے وعدہ کیا ہے کہ اگر ان کے پہرہ داروں نے اپنے عمل سے یہ ثابت کر دیا کہ وہ ایماندار ہیں اور اسلحہ وغیرہ کے ملنے پر وہ اسے صحیح اور جائز طور پر استعمال کریں گے تو انہیں اپنی اور دیہات میں رہنے والوں کی حفاظت کے لیے جدید ترین اسلحہ مہیا کر دیا جائے گا تاکہ وہ ڈاکوؤں کے حملہ کی اچھی طرح روک تھام کر سکیں۔ اب اگر ایک گروہ یہ کہتا ہے کہ اس اسلحہ کی خواہش کرنا خود غرضی ہے اور اس کے حاصل کرنے کے لیے ہر قسم کی کوشش حکومت کی نظر میں ناپسندیدہ ہے تو اس کی عقل پر بجز ماتم کرنے کے اور کیا کیا جا سکتا ہے۔ دوسری طرف وہ گروہ جو ہر بندوق رکھنے والے شخص کو دیکھتے ہی فوراً یہ کہہ اُٹھتا ہے کہ یہ پہرہ دار ہے، اُس کے خاترالعقل ہونے میں کسی ہوشمند آدمی کو شبہ نہیں ہو سکتا۔

تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ ۔

ایسا کیجیو کہ دنیا سے جاؤں تو تیری فرمانبرداری کی حالت میں جاؤں اور اُن لوگوں میں داخل ہو جاؤں جو تیرے نیک بندے ہیں ۔

یہ تصریحات اس حقیقت کو واضح کرنے کے لیے کافی ہیں کہ اسلام کا نظریۂ مملکت تھیاکریسی سے بالکل مختلف ہے، ایک کے نزدیک یہ ڈاکوؤں کا راج ہے، ایک ایسی برائی جس سے ہر شخص کو نفرت کرنا چاہیے ۔ دوسرے کے نزدیک یہ ایک ایسی قوت ہے جس کی مدد سے انسان کو انسانوں کے بندھن سے آزاد کیا جا سکتا ہے اور اس لحاظ سے اللہ کا بہت بڑا فضل اور احسان ۔ علامہ ابن خلدون نے اس امر کی وضاحت جس خوبی سے کی ہے، وہ اس قابل ہے کہ اُسے پیش کیا جائے ۔ وہ فرماتے ہیں : ۔

" سیاست عقلیہ محض فلاح دنیا کے لیے ہے ۔ جس سے محض دنیا کی ظاہری باتیں معلوم ہو جاتی ہیں اور بس ۔ اور شارع کا مقصود ہے اصلاح آخرت، اس لیے ضروری ہے کہ مقتضائے شریعت عامہ خلائق دینی اور دنیاوی امور میں شریعت کے احکام کی کاربند رہے ۔ پس جو لوگ منجانب اللہ اشاعت شریعت پر مامور ہوتے ہیں اُنہیں انبیاء اور رسول کہتے ہیں اور جو ان کے بعد اُن کے قائم مقام ہو کر اُن کے قانون کی حفاظت کرتے ہیں خلفا کہلاتے ہیں ۔ اب ہمیں مملکت اور عقلی سیاست و خلافتِ نبوی کی تعریف یوں کرنی چاہیے کہ طبیعتِ مملکت عامۂ خلائق کو سلطانی اغراض اور ہوا و ہوس کے پورا کرنے پر مجبور کرتی ہے اور مملکتِ سیاسیہ حسب مقتضائے عقل دنیاوی منفعت کے حصول اور دنیاوی نقصان کے دفع کرنے کا ذریعہ ہے ۔ اور خلافت، احکام شرعیہ کے موافق ہی انسان کو اخروی و دنیاوی مصالح کے راستے پر چلاتی ہے ۔ آخرت تو اس کا مقصود بالذات ہی ہے، رہے معاملات دنیا تو وہ بھی شارع کے نزدیک تماماً مصالح اخرویہ کی طرف راجع ہیں ۔ کیونکہ دنیا آخرت کی کھیتی ہے ۔"

قرآن حکیم نے ایک صالح سیاسی نظام کے وجود کو ہی ضروری قرار نہیں دیا بلکہ نہایت صراحت

ے ساتھ اُس کی ذمہ داریوں کو بھی گنوایا ہے۔ تھیاکریسی کو لازماً مستبد اور جابر ہونا چاہیے۔ کیونکہ اُس کے مظالم کو سہنے کے بعد ہی عوام کو گناہوں سے نجات حاصل ہوگی۔ اس کے برعکس اسلام نے حکومت پر فرض عائد کیا ہے کہ وہ ایک ایسا نظام قائم کرے جس سے برائیاں مٹیں اور نیکیاں پروان چڑھیں۔ چنانچہ قرآن حکیم میں ارشاد ہوتا ہے:۔

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ۔ (الحج۔٦)

جن کو اگر ہم زمین میں اقتدار بخشیں گے تو وہ نماز قائم کریں گے۔ زکوٰۃ دیں گے، نیکی کا حکم کریں گے اور بدی سے روکیں گے۔

اس آیت میں اسلامی حکومت کے مقصدِ وجود اور اس کے بنیادی فرائض کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہاں عوام پر ظلم کرنے کی بجائے، حکومت پر یہ فرض عائد کیا گیا ہے کہ وہ نہ صرف خارجی خطرات اور اندرونی خلفشار کو دور کرنے پر اکتفا کرے بلکہ ایک مثبت پروگرام کے ساتھ اُن بھلائیوں کو فروغ دینے کے لیے کوشش کرے جنہیں خدا اور اُس کا رسولؐ بھلائی قرار دیتے ہیں اور اُن برائیوں کو روکے جنہیں خدا اور رسولؐ برائی کہتے ہیں۔

اس سے ایک اور حقیقت بھی کھل کر سامنے آتی ہے، تھیاکریسی اپنے مقصدِ وجود کے اعتبار سے ایک ایسا نظام پیش کرتی ہے، جس میں حکومت پر سوائے ظلم کرنے کے اور کوئی ذمہ داری عائد نہیں کی جاسکتی ہے۔ اس کے برعکس اسلام حکومت پر کچھ ذمہ داریاں عائد کرتا ہے، جن کی بجاآوری اس کے اولین مقاصد میں سے ہے۔ ان میں سے سب سے بڑی ذمہ داری شہریوں کے جان، مال، آبرو کی حفاظت کی ذمہ داری ہے۔ اس چیز کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بکثرت احادیث میں بڑی وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔ حجۃ الوداع کے موقع پر آپ نے شہریوں کے اس حق کے متعلق یوں ارشاد فرمایا:۔

ان دماءکم واموالکم واعراضکم حرام کحرمۃ یومکم ھذا۔

تمہاری جانیں اور تمہارے مال اور تمہاری آبروئیں ویسی ہی حرمت رکھتی ہیں جیسی حج کے دن کی حرمت ہے۔

ان چیزوں کی حفاظت کی ذمہ داری کے ساتھ الا بحقھا وحسابھم علی اللہ کی قید لگا کر اس حقیقت کو واضح فرما دیا کہ ریاست کسی شہری کی ان چیزوں میں کوئی مداخلت صرف اسلامی قانون کے اندر ہی کر سکتی ہے۔

(ب) تھیا کریسی میں برسرِ اقتدار طبقہ کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ لوگوں کے اموال سے جس قدر چاہے حصّہ لے لے، اور کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ ان کے خلاف کوئی بات بھی کر سکے۔ اسلام اس کے برخلاف ہر شہری کی ملکِ ذاتی کو جس کا وہ از روئے شریعتِ اسلامی جائز طریقہ سے مالک بنا ہے، حفاظت کرتا ہے۔ قاضی ابو یوسف کتاب الخراج میں فرماتے ہیں

ولیس للامام ان یخرج شیئا من	امام (حکومت) کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ کسی
احد الا بحق ثابت معروف	ثابت شدہ قانونی حق کے بغیر کسی شخص کے قبضے سے اس کی کوئی چیز نکالے۔

اگر کسی شخص کی ملک ذاتی پر حکومت کو کسی اجتماعی ضرورت کے لیے قبضہ کرنے کی ضرورت پیش آئے تو اُس کے حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ یا تو اس کی رضامندی حاصل کی جائے یا اُسے اُس کا معقول معاوضہ دیا جائے[1]۔

(ج) اسلام اور تھیا کریسی میں ایک اور فرق اُن کے عدالتی نظام کا اختلاف ہے۔ تھیا کریسی میں جج اقتدارِ اعلیٰ کے نائب ہونے کی حیثیت سے منزّہ عن الخطا سمجھا جاتا ہے۔ اُس میں دلوں کے راز جاننے اور قدرت کے اشارے سمجھنے کی قوت ہوتی ہے۔ اس لیے وہ نہ تو کسی گواہ کی شہادت کا محتاج ہوتا ہے

---

[1] اس کی تائید میں مولانا امین احسن صاحب اصلاحی نے الاستیعاب جلد ۲ سے ایک واقعہ نقل فرمایا ہے:۔

> "جنگِ حُنین کے لیے جاتے ہوئے آپؐ نے صفوان بن امیّہ سے زرہیں حاصل کی تھیں اور جب اُس نے کہا "اَغَصْبًا یَا مُحَمّدُ" کیا بلا معاوضہ لے لینے کا ارادہ ہے اے محمدؐ۔ آپؐ نے فرمایا نہیں "بل عاریۃ مضمونۃ"۔ یہ مستعار ہیں اور جو ان میں سے ضائع ہوگی ان کا معاوضہ دیا جائے گا۔"
>
> (اسلامی ریاست۔ شہریت کے حقوق و فرائض)

اور نہ ہی مجبوم کی صفائی کا۔ حقیقت حال لوگوں کی آنکھوں سے خواہ کتنی ہی اوجھل کیوں نہ ہو مگر اُس کے سامنے بالکل بے نقاب ہوتی ہے۔ چنانچہ ہنری چارلس لی (HENERY CHARLES LEA) اپنی کتاب (A HISTORY OF THE INQUISITION') میں لکھتا ہے:۔

> کسی مشتبہ گنہ گار کا فیصلہ عدالت میں آنے سے پہلے ہی ہو جاتا۔ منصف کی کوششوں کا مقصد یہ نہ تھا کہ اُس بدنصیب کو ناانصافی سے بچایا جائے بلکہ یہ تھا کہ اُس سے کسی نہ کسی طرح جرم منوا کر کلیسا کی لاج رکھی جائے۔ اسی مقصد کے حصول کے لیے صفائی کے مواقع کم کر دیے گئے۔

اس کے برعکس اسلام میں کسی شخص کی آزادی معروف قانونی طریقے پر اُس کا جُرم ثابت کیے بغیر اور اُسے صفائی کا موقع دیئے بغیر سلب نہیں کی جا سکتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام کسی بڑے سے بڑے انسان کو بجز انبیا کے معصوم نہیں سمجھتا۔ یہاں نہ تو کوئی غیب کا علم جانتا ہے اور نہ انبیاء کے علاوہ قدرت کا رازداں۔ اس لیے ہر شخص کو پوری صفائی کا موقع دیا جاتا ہے۔ چنانچہ نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم سے بکثرت ایسی روایات ملتی ہیں جن سے لوگوں کے اس حق کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔

عن بهز بن حكيم عن ابيه انه (اعنى جدهٗ) قام الى النبى صلى الله عليه وسلم وهو يخطب، فقال جيرانى بما اخذ؟ فاعرض عنه مرتين، ثم ذكره ما شاء فقال النبى صلى الله عليه وسلم خلوا له جيرانهٗ

(ابوداؤد)

بہز بن حکیم اپنے باپ سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ وہ (یعنی ان کے دادا) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آنحضرت اس وقت خطبہ دے رہے تھے۔ انہوں نے سوال کیا کہ میرے پڑوسیوں کو کس قصور میں گرفتار کیا گیا ہے؟ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دو مرتبہ تو ان کے سوال کی طرف توجہ نہ فرمائی۔ لیکن انہوں نے (سائل نے) پھر کچھ کہا تو آپ نے حکم دیا کہ اُن کے

پڑوسیوں کو رہا کر دو۔

عن علی رضی اللہ عنہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال یا علیؓ! اذا جلس الیک الخصمان فلا تقض بینہما حتی تسمع من الآخر کما سمعت من الاول

حضرت علی (کرم اللہ وجہ) سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے علی! جب تمہارے سامنے دو فریقِ معاملہ پیش ہوں تو ان کے درمیان اس وقت تک فیصلہ نہ کرو جب تک کہ دوسرے کا بھی اس کا بیان اسی طرح نہ سن لو جس طرح پہلے کا بیان سنا ہے۔

(باقی)

قارئینِ "ترجمان" کو اخبارات کے ذریعہ غالباً اس اندوہناک خبر کا علم ہو چکا ہوگا کہ ہمارے محترم اور مقتدر رفیق مولانا مسعود عالم صاحب ندوی (جن کا ایک مضمون اسی شمارے میں شامل ہے) کراچی میں سولہ اور سترہ مارچ کی درمیانی رات کو اس دارِ فانی سے رحلت کر کے رفیقِ اعلیٰ کے ہاں پہنچ گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

مرحوم و مغفور کی وفات نے صرف ان کے اعزہ کو ہی ایک عظیم صدمہ نہیں پہنچایا، اور صرف جماعت اسلامی پاکستان کو ہی ایک مخلص اور قیمتی کارکن سے محروم نہیں کر دیا، بلکہ آپ کا اٹھ جانا دنیائے اسلام کے تمام علمی و دینی حلقوں کے لیے ایک بہت بڑا نقصان ہے۔ ناظرین دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنی مغفرت سے نوازے اور ان کے اعزہ اور رفقاء کو صبر و ثبات عطا فرمائے، آمین!

(ادارہ)